© rasailojaraid.com

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

نظرات

البنا العظیم

(۴)

اب تک جو کچھ عرض کیا گیا پس منظر کے طور پر تھا۔ اب ہمیں اصل موضوع گفتگو کی طرف رجوع کرنا چاہئے۔ لیکن اولاً یہ بات ذہن میں رکھنا ضروری ہے کہ جب ہم کسی بھی معاملہ پر غور کرتے ہیں تو سب سے پہلے دیکھنا یہ ہوتا ہے کہ ہمارا نقطۂ نظر (Approach) کیا ہے۔ جب یہ نقطۂ نظر متعین ہو جاتا ہے تو اس سے ایک قسم کا رجحان (Attitude) پیدا ہوتا ہے اور پھر جو کچھ بھی فیصلہ ہوتا ہے وہ انھیں دو چیزوں کے تابع ہوتا ہے۔ اور جہاں تک نقطۂ نظر (Approach) کا تعلق ہے اس کی تشکیل اس فلسفۂ حیات یا ان افکار و نظریات سے ہوتی ہے جو کسی انسان کے لئے فکر و ذہن کا کوئی ایک خاص سانچہ یا پیمانہ مہیا کرتے ہیں۔ اس بنا پر اب ہماری گفتگو مندرجۂ ذیل تین عنوانات پر اسی ترتیب سے ہوگی۔

(۱) ہندوستان کے موجودہ حالات کے تعلق سے اسلام کی وہ کونسی تعلیمات ہیں جو ہمارے نقطۂ نظر اور رجحان کو متعین کرتی ہیں۔

(۲) ہندوستان کے حالات کا اصلاً اور ضمناً بین الاقوامی حالات کا جائزہ — ان کی تحلیل اور تجزیہ۔

(۳) مسلمانوں کے لئے صحیح طریقۂ عمل۔

اب سب سے پہلے اسلام کی ان تعلیمات کو لیجئے جو ہمارے لئے نقطۂ منظر اور رجحان کو متعین کرتی ہیں اور وہ حسب ذیل ہیں:

(۱) ان میں سب سے مقدم، اہم اور بنیادی عقیدۂ توحید ہے۔ اس عقیدہ کا مفاد یہ ہے کہ

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

ہماری طلب وجستجو، تمنائیں اور آرزو اور ہماری امیدیں اور خوف ان سب کا تعلق خدا اور صرف خدا کے ساتھ ہونا چاہئے یعنی ایک مسلمان کو صرف ظاہری اور زبانی طور پر نہیں بلکہ دل کی گہرائیوں میں اس بات کا یقین رکھنا چاہئے کہ خیر و شر اور نفع و ضرر کی ساری کنجیاں خدا کے ہاتھ میں ہیں۔ وہ جو چاہتا ہے وہی ہوتا ہے۔ اس کی مشیت کو کوئی طاقت اور کوئی قوت رد نہیں کر سکتی۔ وَاللّٰہُ غَالِبٌ عَلٰی اَمْرِہٖ

(۲) اللہ تعالیٰ کی مشیت کیا ہے؟ اگر انسانوں کو اس کا علم نہ ہوتا تو کم از کم جو لوگ کسی نہ کسی مذہب کو مانتے اور اس طرح خدا پر بھی ایمان رکھتے ہیں ان کا نظامِ زندگی درہم برہم یا کم از کم بے یقینی کا شکار ہو کر معطل ہو جاتا۔ کیونکہ جب ان کا عقیدہ یہ ہوتا کہ خدا جو چاہتا ہے وہ کرتا ہے اور وہ اپنے چاہنے میں کسی بات کا پابند نہیں ہے۔ تو وہ ایک مومن کو عذابِ جہنم میں مبتلا کرنا اور ایک کافر کو راحت و عشرتِ جنت سے متمتع کرنا بھی پسند کر سکتا ہے۔ اور وہ مشیت میں آزاد ہونے کے ساتھ بے نیاز اور مستغنی بھی ہے۔ کوئی شخص اس کی عبادت کرے یا نہ کرے، اس پر ایمان لائے یا نہ لائے، جہاں تک خدا کی ذات کا تعلق ہے اس کے لئے یہ دونوں چیزیں برابر ہیں۔ کسی چیز سے خوش ہونا یا کسی چیز سے ناراض ہونا آثار و لوازمِ حوادث میں سے ہے اور خدا کی ذات جو ازلی اور ابدی ہے وہ ان سے بلند و بالا اور مبرا و منزہ ہے۔ اس بنا پر اللہ تعالیٰ کا یہ بڑا فضل و کرم ہوا (اور جس کو اس نے خلافتِ ارضی عطا فرمائی تھی اس کے لئے بیحد ضروری بھی تھا) کہ اس نے اپنی مشیت کو بے قید و آزاد نہیں رکھا بلکہ اسے خود "تقدیرِ الٰہی" سے وابستہ فرما دیا۔ یہ تقدیرِ الٰہی وہی ہے جس کو ہم عالم اسباب و مسببات کہتے ہیں۔ اور چونکہ زندگی خواہ وہ معنوی اور روحانی ہو۔ یا جسمانی اور مادی۔ اور کائنات خواہ وہ ارضی ہو یا سماوی یہ سب تقدیرِ الٰہی یا بالفاظ دیگر اسباب و مسببات کی زنجیروں میں جکڑے ہوئے ہیں اسی بنا پر اللہ تعالیٰ قرآن مجید میں ہر شے سے متعلق عقل سے کام لینے اور ان میں تفکر اور تدبر کی دعوت دیتا اور ان پر آمادہ کرتا ہے۔ ورنہ ظاہر ہے اگر زندگی اور کائنات کے لئے کوئی قانون یا نظام ہی نہ ہوتا اور یہ سب کچھ بے قید مشیتِ ایزدی کی کرشمہ سازیوں کا نتیجہ ہوتا تو پھر ان میں غور و فکر کی ضرورت ہی کیا تھی؟ اور اگر کوئی غور و فکر کرتا بھی تو اس کا حاصل کیا ہوتا؟ چنانچہ قرآن مجید میں

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

"اِنَّ اللّٰہَ لَیْسَ بِظَلَّامٍ لِّلْعَبِیْدِ" اللہ اپنے بندوں پر ظلم نہیں کرتا۔ اور "اِنَّ اللّٰہَ لَا یُخْلِفُ الْمِیْعَادَ" بیشک اللہ تعالیٰ اپنے وعدہ کی خلاف ورزی نہیں کرتا۔ یا ان کے علاوہ اور بہت سی آیات جن میں وعدہ وعید خداوندی کے مضامین بیان کئے گئے ہیں ان سب سے یہی ثابت ہوتا ہے کہ اگرچہ اللہ تعالیٰ کی قدرت ہر چیز پر ہے اور پھر وہ جس چیز کی مشیت یا ارادہ کرے اس سے اُسے روکنے والا بھی کوئی نہیں ہے۔ لیکن زندگی اور کائنات سب تقدیر الٰہی کی یعنی اسباب ومسببات کے اس قانون اور ضابطہ کی پابند ہیں جن کا خالق اور موجد خود ربُّ السّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ہے۔ ممکن ہے آپ فرمائیں کہ اتنی بدیہی بات پر اس قدر طولِ کلام کی ضرورت کیا ہے ؟ تو گذارش یہ ہے کہ ابھی چند ماہ ہوئے ایک دینی ماہنامہ میں ایک "مولانا" کا مضمون نظر سے گذرا جس میں انھوں نے بڑی قوت سے لکھا تھا کہ مسلمانوں کے لئے کسبِ معاش کرنا ضروری نہیں ہے۔ کیونکہ قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ نے ہر متنفس کے لئے خود رزق پہونچانے کا ذمہ لے لیا ہے۔ علاوہ ازیں ضبطِ ولادت کی مخالفت میں جو لوگ لکھتے رہتے ہیں وہ بھی عام طور پر غربت و افلاس کی بحث میں اسی مذکورۂ بالا آیت سے استدلال کرتے ہیں۔

(۳) معاملات میں ایک انسان کو دوستی اور دشمنی، موافقت اور مخالفت، محبت اور نفرت، ان سب سے ہی سابقہ پڑتا ہے۔ اس سلسلہ میں اسلام کی تعلیمات بالکل واضح اور صاف ہیں۔ اور وہ یہ کہ اگر کوئی شخص نیکی، حسنِ سلوک اور دوستی کا معاملہ کر رہا ہے تو مسلمان کو حکم یہ ہے کہ وہ اس شخص کے ساتھ اس سے زیادہ نیکی، دوستی، اچھائی کا معاملہ کرے۔ قرآن مجید میں ارشاد ہے وَاِذَا حُیِّیْتُمْ بِتَحِیَّۃٍ فَحَیُّوْا بِاَحْسَنَ مِنْھَا۔ اگر تم کو کسی قسم کا سلام کیا جائے تو تم اس سے زیادہ بہتر طریقہ پر سلام کرو۔ اور اگر معاملہ اور برتاؤ دشمنی اور مخالفت کا ہے تو اب اسلام کی تعلیم یہ ہے کہ (۱) تم حسنِ سلوک اور حسن خلق سے بہرحال پیش آؤ۔ کیونکہ اس طریق عمل سے تم اس کا قلب فتح کر سکتے ہو اور اس طرح دشمن کو دوست بنا سکتے ہو۔ ارشاد ہے: اِدْفَعْ بِالَّتِیْ ھِیَ اَحْسَنُ۔ فَاِذَا الَّذِیْ بَیْنَکَ وَبَیْنَہٗ عَدَاوَۃٌ کَاَنَّہٗ وَلِیٌّ حَمِیْمٌ (تم پر اگر کوئی شخص حملہ کرے) تو تم اس طرح اس کو دفع کرو کہ تمہارا دشمن ایک گہرا دوست جیسا بن جائے لیکن اس راستہ پر چلنا ہر شخص کے بس کی بات نہیں ہے۔ چنانچہ اس آیت کے بعد ہی فرمایا گیا: اس راستہ

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

کو وہی لوگ اختیار کر سکتے ہیں جو صبر کرنے والے اور خوش نصیب لوگ ہیں (۲) یہ مقام تو بہت اونچے درجہ کے لوگوں کا ہے۔ لیکن اس سلسلہ میں ہر مسلمان کا جو فرض ہے اور جس سے وہ کسی حالت میں بھی مستثنیٰ نہیں ہو سکتا وہ ہے عدل و انصاف یعنی معاملہ خواہ دوست کا ہو یا دشمن کا۔ ایک مسلمان کے لئے بہر حال خدا لگتی بات کہنا اور عدل سے کام لینا ضروری ہے۔ یہ عدل خواہ اس کے اپنے ہی خلاف ہو یا اس کے والدین کے خلاف ہو۔ چنانچہ بعینہٖ اسی مضمون کی ایک آیت سورۂ نساء میں موجود ہے۔ جس کے آخر میں ارشاد ہوا: فَلَا تَتَّبِعُوا الْهَوٰىٓ اَنْ تَعْدِلُوْا، پس دیکھو من مانی نہ کرو کہ اس کی وجہ سے حق سے انحراف کرنے لگو۔ اسی مضمون کی ایک آیت سورۂ مائدہ میں ہے جس میں فرمایا گیا ہے کہ "اے ایمان والو! تم اللہ کے لئے انصاف قائم کرنے اور اس کی گواہی دینے والے بنو۔ اور خبردار! کسی گروہ کی دشمنی تم کو اس پر آمادہ نہ کر دے کہ تم عدل ہی نہ کرو۔ نہیں تم بہر حال عدل ہی کرو۔ وہ پرہیزگاری سے زیادہ قریب ہے۔ تم اللہ سے ڈرو۔ وہ جو کچھ تم کرتے ہو اس سے باخبر ہے"۔

لیکن یہ واضح رہنا چاہئے کہ نمبر ایک میں جس حسنِ سلوک اور ملاطفت کی تعلیم دی گئی ہے۔ اور قرآن مجید میں صبر کے جو فضائل جگہ جگہ بیان کئے گئے ہیں اس سے مراد مسکنت، ضعف اور کمزوری بالکل نہیں ہے۔ دشمن کے ساتھ ملاطفت، نرمی اور حسنِ اخلاق کا معاملہ کرنے کی بھی ایک حد ہے ورنہ اگر اس کا یقین ہو جائے کہ دشمن کے لئے یہ سب کچھ بیکار ہے۔ اس نے شرارت، فتنہ پروری اور فساد انگیزی کی قسم کھالی ہے اور اس سے وہ کسی طرح اور کسی قیمت پر بھی باز نہیں آسکتا تو اب اسلام کی صاف تعلیم یہ ہے کہ عملی مقاومت (Active Resistance) کا معاملہ کیا جائے اور اپنی حفاظت کے لئے وہ سب اقدامات کئے جائیں جو ضروری ہیں۔ چنانچہ اس سلسلہ میں فرمایا گیا:

وَاَعِدُّوْا لَهُمْ مَّا اسْتَطَعْتُمْ اور جو کچھ تمہاری استطاعت میں ہے اس کے مطابق ان لوگوں کے لئے تیاری کرو۔

(۳) اس سلسلے میں اسلام کی ایک نہایت اہم تعلیم یہ ہے کہ خیر اور نیکی انسان کی اصل فطرت ہے اس بنا پر اس میں بدی اور شر پسندی کا رجحان یا جذبہ پیدا ہوتا ہے تو وہ خارجی عوامل اور مؤثرات

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

کے باعث پیدا ہوتا ہے۔ چنانچہ قرآن میں فِطْرَتَ اللّٰہِ الَّتِیْ فَطَرَ النَّاسَ عَلَیْھَا فرما کر اس حقیقت کی نشاندہی کی گئی ہے۔ علاوہ ازیں حدیث میں بھی ارشادِ نبوی ہوا: ہر بچہ فطرتاً اسلام پر پیدا ہوتا ہے۔ پھر یہ اس کے گھر کے ماحول کا اثر ہوتا ہے کہ وہ کچھ اور بن جاتا ہے۔ غور کیجیے۔ انسانی معاملات اور باہم دگر معاشرت اور برتاؤ کے سلسلہ میں اسلام کا یہ نظریہ کس طرح ایک بنیاد اور اساس کا حکم رکھتا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ کوئی انسان کیسا ہی بد باطن اور بدکار ہو بہر حال اس سے بحیثیت انسان کے مایوس کبھی نہیں ہونا چاہیے۔ اور بطریقِ احسن اس کی اصلاح اور تہذیب و تربیت کی کوشش برابر جاری رہنی چاہیے۔ چنانچہ خود پیغمبروں کا عمل اس کا واضح ثبوت اور اس کا آئینہ دار ہے۔

(۵) بنی نوعِ انسان کے متعلق مسلمانوں کے رشتہ سے اسلام کا جو نظریہ ہے وہ یہ ہے کہ (۱) تمام انسان ایک آدم و حوّا کی اولاد ہیں۔ اس بنا پر رنگ و نسل، دولت و غربت اور قومیت و وطنیت کی بنیاد پر ان میں باہم برتری اور کمتری کا امتیاز پیدا کرنا بالکل غلط ہے۔ اگر کوئی چیز معیارِ برتری ہو سکتی ہے تو وہ صرف نیک عملی اور پاکبازی ہے (۲) علاوہ ازیں دوسری اہم چیز یہ ہے کہ خدا نے دنیا کی ہدایت کے لئے ہر قوم ہر ملک اور ہر زمانہ میں پیغمبر بھیجے اور ان میں سے چند پیغمبر ہیں جن پر کتابیں اتریں۔ لیکن حضور صلی اللہ علیہ وسلم پر پیغمبری ختم ہوگئی اور قرآن بھی آخری کتابِ الٰہی ہے۔ اب اس کے بعد کوئی اور کتاب نازل نہیں ہوگی! اب سوال یہ ہے کہ انسان پر وقفہ وقفہ کے بعد ضلالت اور انحراف عن الحق کا غلبہ اور تسلط تو بعثتِ نبوی سے قبل ازمنۂ قدیمہ کی طرح برابر ہوتا رہے گا۔ تو پھر جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد کوئی اور پیغمبر کبھی نہیں آئے گا تو اللہ کی سنتِ قدیمہ کے اعادہ کی صورت کیا ہوگی؟ قرآن میں اس سوال کا جواب ارشاد ہوا: وَكَذٰلِكَ جَعَلْنٰكُمْ اُمَّةً وَّسَطًا لِّتَكُوْنُوْا شُهَدَآءَ عَلَى النَّاسِ وَيَكُوْنَ الرَّسُوْلُ عَلَيْكُمْ شَهِيْدًا ط اور اسی طرح ہم نے تم کو ایک معتدل قوم بنایا ہے تاکہ تم لوگوں پر اور پیغمبر تمہارے اوپر گواہ بن جائیں۔ یہ اور اسی طرح کی بعض اور آیات کا صاف مطلب یہ ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نہ قیامت تک دنیا میں رہ سکتے تھے اور نہ آپ اپنی زندگی میں بھی دعوت و تبلیغِ حق کے لئے دنیا کے کونہ کونہ میں پہونچ سکتے تھے۔ اس بنا پر اللہ تعالیٰ نے پیغامِ محمدی کو ہمہ گیر

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

اور دائمی بنانے کی غرض سے کیا گیا! آنحضرت کے ذریعہ ایک قوم پیدا کی جس کا نام امتِ محمدیہ ہے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا جو فریضہ دعوت الی اللہ اور شاہد بالحق ہونے کا اس امت کی طرف تھا بعینہٖ وہی فریضہ امتِ محمدیہ کا سارے عالم کی طرف مقرر فرمادیا۔ پس جب امتِ محمدیہ کی نسبت پورے عالمِ انسانیت کے ساتھ یہ ہے تو لامحالہ اب اخلاق میں، کردار میں، برتاؤ اور طور طریق میں غرض کہ ہر چیز میں امتِ محمدیہ کو من حیث المجموع آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا نمونہ بننا ہوگا۔ حضور کی شان یہ تھی کہ رحمتِ عالم تھے۔ نرم خو، نرم گفتار (فَبِمَا رَحْمَةٍ مِّنَ اللّٰهِ لِنْتَ لَهُمْ) دوست دشمن ہر ایک کے دل سے ہمدرد و مددگار، مصائب پر صابر، انعاماتِ خداوندی پر شاکر، ناکامیوں پر بددل اور بیزار اور کامیابیوں پر مغرور و نازاں نہ ہونیوالے، خود تکالیف و محن اٹھاکر دوسروں کے لئے راحت و آرام کا سامان کرنیوالے، دنیا کے تمام غریبوں مظلوموں اور ستم رسیدہ انسانوں کا درد و غم (بلاامتیازِ رنگ ونسل و مذہب وملت) اپنے دل کی گہرائیوں میں رکھنے اور اس کی چارہ گری کرنے والے تھے۔ سرورِ کونین حلیم و بردبار تھے۔ جو بات فرماتے یا کرتے کمال متانت و وقار سے فرماتے اور کرتے تھے۔ پس اگر یہ سچ ہے کہ قرآن میں اللہ تعالیٰ نے امتِ محمدیہ کا منصب اور وظیفہ حیات وہی مقرر کیا ہے جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ان کے تعلق سے تھا تو کوئی شبہ نہیں کہ اب ان کا عمل اور کردار، ان کے اخلاق اور ان کا برتاؤ بھی سیرتِ نبوی کے سانچہ میں ڈھلا ہوا ہونا چاہیئے۔ ہر پھل اور میوہ اپنے مزہ سے پہچانا جاتا ہے اگر ہم مسلمانوں کو ایک پھل سے تشبیہ دیں تو قرآن مجید کی مذکورۂ بالا آیت کی زبان میں اس پھل کا مزہ اور ذائقہ لازمی طور پر "شُهَدَاءَ عَلَى النَّاسِ" ہوگا۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ اگر یہ مزہ محسوس ہوتا ہے تو پھل یقیناً موجود ہے ورنہ......

کوئی بتلاؤ کہ ہم بتلائیں کیا!!

بہرحال یہ ہیں اسلام کی وہ تعلیمات جو انسانی علائق و روابط اور ان کے مسائل کے متعلق مسلمانوں کا Approach اور Attitude متعین کرتی ہیں۔

© rasailojaraid.com